

غزل بہانہ کگروں

احمد فراز



غزل بہانہ کھروں

احمد فراز

GHAZAL BAHANA KARON

(Urdu Poetry)

by

AHMAD FARAZ

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-24-2

Price. Rs. 80/=

غزل بہانہ کروں	نام کتاب
احمد فراز.	مصنف ..
۲۰۰۲ء ..	سن اشاعت .
۸۰ روپے ..	قیمت
کاک پر ندرس، دہلی	مطبع

Published by:

Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E-mail kitabiduniya@rediffmail.com

ڈاکٹر محمد
کے نام

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاوں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگتاوں اُسے

الف

ترتیب

آتش فشاں سید ضمیر جعفری

- ۹ عرض غم کبھی اس کے رو برو بھی ہو جائے
 ۱۵ جب تجھے یاد کریں کارِ جہاں سمجھنگا ہے
 ۲۱ کل ہم نے بزم یار میں کیا کیا شراب پی
 ۲۶ جس کے لیے ہیں جاں بلب اس کو نہیں ملاں بھی
 ۳۱ چلی ہے شرمیں کیسی ہوا اداسی کی
 ۳۵ کل نالہ، قمری کی صدائیں نہیں آئی
 ۴۱ یہ جو سرگشت سے پھرتے ہیں کتابوں والے
 ۴۹ ہم کہ منت کش صیاد نہیں ہونے کے
 ۵۱ پھر تمہرے نہ آنے کی خبر شام میں آئی
 ۵۷ نہ تیرا قرب نہ بادہ ہے کیا کیا جائے
 ۶۳ میں مر مٹا تو وہ سمجھا یہ انتہا تھی مری
 ۶۷ شرِ محبت، بھر کا موسم، عمدہ وفا اور میں
 ۷۳ جانے نئے میں کہ وہ آفتِ جاں خواب میں تھا
 ۷۹ نہیں کہ نامہ بروں کو تلاش کرتے ہیں
 ۸۱ وہ جو آ جاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
 ۸۷ آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی

ب

کرتے بھی کیا جانا پڑا پھر سے اسی قاتل کے پاس
 کسی سے دل کی حکایت کبھی کہا نہیں کی
 مسافرت میں بھی تصورِ گھر کی دیکھتے ہیں
 وہ شیں بڑھتی ہنسیں ہجر کے آزار کے ساتھ
 تیرا غم اپنی جگہ دنیا کے غم اپنی جگہ
 کیوں طبیعت کیسیں نہ سرتی نہیں
 اس کی نوازشوں نے تو حیران کر دیا
 اک شام ہے انتظار جیسی
 لگتا ہے کہ اب چاہتیں آسائیں زیادہ
 ہم اہلِ دل کو بھی کردار کیا دیے گئے ہیں
 کل پر سُر احوال جو کی یار نے میرے
 منزلیں ایک سی آوار گیاں ایک سی ہیں
 چلو کہ کوچہ دلدار چل کے دیکھتے ہیں
 یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم
 غزل سن کر پریشان ہو گئے کیا
 دو گھونٹ کیا پئے کہ بدن میں گلی ہے آگ
 جو بھی قاصد تھا وہ غیروں کے گھروں تک پہنچا
 عاشقی بے دلی سے مشکل ہے
 ملول کر ہمیں اتنا ملول کر جاناں

۳۷

۳۹

۵۱

۵۳

۵۵

۵۶

۵۸

۶۰

۶۳

۶۵

۶۷

۶۸

۷۰

۷۲

۷۴

۷۶

۷۸

۸۰

۸۲

- دل نھرنے دے تو آنکھیں بھی جھکتے جاویں
83
- ہیں زخم بست اور بھی دل پر مرے آگے
86
- کل شب تھا عجب دید کا منظر مرے آگے
89
- نہ شب و روز ہی بد لے ہیں نہ حال اچھا ہے
92
- دشیت افراد میں اک پھول کھلا ہے سو کماں
93
- ہم بھی مانگنیں مراد ہو کچھ تو
96
- کچھ ہمیں اس سے جان کرنہ کھلے
97
- وحشتِ دل طلبِ آبلہ پائی لے لے
99
- چشمِ گرباں میں وہ سیلاں تھا اے یار کہ بس
101
- انتے بھی تو وہ خفائنیں تھے
103
- تھنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے
105
- شعار اپنا ہی جس کا بہانہ سازی تھا
107
- یوں دل سے کسی درد کا پیاں نہیں کرتے
109
- دل سلگتا ہے مگر سوتھے جانی کم ہے
111
- جو چل سکو تو کوئی ایسی چال چل جانا
113
- اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بت ہوا
115
- ہم نہیں تو کہانی اور ہے
117
- نہ منزلوں کو نہ ہم رگہز کو دیکھتے ہیں
119
- گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دہن تم جیسے
121

- ۱۲۳ کبھی جو راحت جاں تھا اسے بھلا بھی دیا
- ۱۲۴ اشک تعبیر اور خواب نہیں
- ۱۲۵ زخم ہجراء کا بھر گیا کچھ کچھ
- ۱۲۶ یہ بے دلی ہے تو کشتی سے یار کیا اتریں
- ۱۲۷ کسی کی یاد میں اتنا نہ رو ہوا سو ہوا
- ۱۲۸ ہنگامہ مغلل ہے کوئی دم کہ چلا میں
- ۱۲۹ نہ تو دیوانے ہی بن پائے نہ دانا مرے دوست
- ۱۳۰ وہ تو پتھر پہ بھی گزرے نہ خدا ہونے تک
- ۱۳۱ خوش کون رہا پوش ہجراء کو پس کر
- ۱۳۲ نامہ تو ہم نے بھیجا ہے اس کو صبا کے ہاتھ
- ۱۳۳ پھرا ہوں سارے زمانے میں دربدار کیسا
- ۱۳۴ کیوں نہ ہم عبدِ رفاقت کو بھلانے لگ جائیں
- ۱۳۵ چاہت کے صبح و شام محبت کے رات دن
- ۱۳۶ پھرتے ہیں اب بھی دل کو گریاں کئے ہوئے
- ۱۳۷ صدر نگ چمن دیدہ ہجراء میں پھرے تھا
- ۱۳۸ حیرت ہے لوگ اب بھی اگر خوش عقیدہ ہیں
- ۱۳۹ دل بدن کا شریکِ حال کہاں
- ۱۴۰ ایک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہستا جاتا
- ۱۴۱ وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا بھی رنگ اتار کے شر کا

آتش فشاں

احمد فراز کے تذکرے کے لئے — کہ جواب کتابوں میں نہ ساکے — تفصیل تو کہا، مجھ سے آپ کسی ترتیب کی بھی توقع نہ رکھیں۔ قدرت نے، اپنی بے شمار نوازشات میں ایک کرم مجھ پر یہ بھی کر رکھا ہے کہ میں غلط فیصلے بھی نجیک وقت پر کرتا ہوں۔ سو، میں نے پہلے فراز کی ذات پر بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کہ فراز کی شاعری کا تذکرہ مجھ پر بتا۔ سل بھی ہو گا۔ سل اس لئے کہ مجھے تجزیاتی سندروں کے پانوں میں نہیں اترتا۔ اس کی شاید ضرورت بھی نہیں کہ فراز تواب شاعری کے اس مقام پر ہے جہاں وہ اپنے معیار خود بنا سکتا ہے۔

فراز سے پہلی مطاقت ۱۹۳۸ء میں ایبٹ آباد کی پہاڑی پر — خان فقیرا خان جدون کے جھرے میں ہوئی جو صوبہ سرحد کی ایک اہم دلچسپ اور پراسرار صحافتی، سماجی اور سیاسی شخصیت تھے۔ محسن احسان بھی ساتھ تھے۔ موسم بر سات کی یہ شام باہر کی طرح اندر بھی خاصی بھیگی رہی۔ یہ دونوں ان دونوں، اپنی جوانی اور شاعری کی دلیل پر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ دونوں کے چہروں کی طرح دونوں کی شاعری بھی چونکا دینے والی تھی۔ میٹھے دونوں تھے۔ مگر محسن احسان دھیما اور شرمنیلا۔ فراز، شوخ و شنک — ٹفتہ۔ چمب دلبرانہ، ڈھب جارحانہ۔ آدمی اس سے مل کر بھول نہ سکتا۔ نہ اس کو نہ اس کی شاعری کو۔ فراز ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے، جو پروفیسر شوکت واسطی اور راتم نے "کشمیر فنڈ" کے لئے بربا کیا تھا ایبٹ آباد آئے تھے۔ مشاعرے میں دو شاعروں ہی سے سامعین کے اصرار پر کشمیر کے موضوع کے علاوہ ان کی مقبول نظموں کی فرمائش کی گئی۔ ابوالاٹر حفیظ جالندھری سے "بوزھی رقصہ" کی اور احمد فراز کی نوجوان "لختی" کی۔

اس مشاعرے کا یہ حیران کن منظر بھی مجھے یاد ہے کہ مشاعرے کے اختتام پر "آٹو

"گراف" لینے کا جتنا ہجوم حفیظ صاحب کے گرد تھا اتنا ہی ہجوم فراز کے گرد تھا۔ اور تم بالائے تم یہ کہ اس لئے کو زیادہ تر کالج کی طالبات نے گھیر رکھا تھا۔ غالباً" اس کی شاعری کے ساتھ اس کی محل بھی سامعین کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

اگلے دن نمبر ۹ فرنٹیز ڈویشن کے ہمارے جزل آفیسر کمائنگ (GOOC) اور صدر مشاعرہ جزل نذرِ احمد بھی خاصی دلچسپی کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں چائے پر اپنے گورے "جی ون" (G-W) کرائیں بلیک اور ہم دسکی شاف افروں مجرم ذہن الدین اور کیپٹن (اب ریٹائرڈ بریگیڈیئر) قوم کے سامنے فراز کا تذکرہ کرتے رہے۔ گویا طالبات ہی نہیں جرنل بھی اس سے متاثر ہوا۔ جزل صاحب کو کیا معلوم تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر بھی جرنیلوں کو متاثر کرے گا مگر کچھ دوسرے قرینے سے۔

احمد فراز سے ہمارے تعلقات ثیب و فراز سے خالی نہیں۔ ابتداء محبت سے ہوئی۔ پھر کچھ فاسطے حاصل رہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ دھند کبھی دیوار نہ بن سکی۔ میرے لئے تعلق خاطر کا یہ عجیب کرہا ک سارشستہ تھا۔ جیسے بھیکی ہوئی لکڑی سلگ رہی ہو۔ اس کی کوئی رومانی تخلیق نظر پڑتی تو نظر چمک اٹھتی۔ کوئی "طفواني چیز" دیکھتا تو دل بیٹھ جاتا۔ نظر لمتی تو نظریات نکرانے لگتے، نہ اس کو جیب میں رکھ سکتے نہ جیل میں۔ قدم اس کے ساتھ نہ چل سکے، مگر دل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ جس طرح دوسری عالمی جنگ میں ہم ہندوستانی سپاہی۔۔۔ انگریز کی فوج میں جرمنی کی فتح کے لئے لڑتے رہے۔ ایک مرتبہ اوسلو (ناولے) کی ایک تقریب میں۔۔۔ افغانستان کے مسئلے پر۔۔۔ ہماری جھڑپ بھی ہو گئی۔ میں نے اس کو "روس" سمجھا اور اس نے مجھے "وقیانوس" مگر جب غلط فتحی رفع ہوئی تو دونوں نے اپنا غصہ "اووقیانوس" میں تھوک دیا تھا۔ کسی مسئلے پر اختلافات کا یہ مطلب نہیں کہ محاسن کی گواہی بھی نہ دی جائے۔

فوج کے حوالے سے فراز کی ایک لہم کا بڑا چڑا ہوا۔ ہم بھی اس پر بڑے "لال پیلے" ہوئے۔ مگر جب میں نے اس کے لخت جگر سعدی کو کپتانی کی وردوی میں پاکستان کی سرحدوں پر سینہ پر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ اگر فوج کے خلاف ہوتا تو اپنے بیٹے کو فوج میں کیوں بھیجا۔ وہ دراصل مارشل لاء کے خلاف تھا۔ ایوب خان اور یحیی خان کے "مارشل لاؤں" میں بھی اگرچہ وہ "غزالیہ چکلیاں" لیتا رہا۔ مگر ضیاء الحق کے مارشل لاء میں اس کے صبر کا پیانہ اس طرح چھلکا کہ وہ خود بھی چھلک کر برطانیہ میں جا پڑا۔ فراز اور میں۔۔۔ ان دنوں۔۔۔ پاکستان نیشنل سٹر کے سرنشتے میں۔۔۔ رفق کا راستہ، جس کی نوعیت ابلاغی تھی یعنی

ہم تو زندہ ہیں کہ دنیا میں تراثاں رہے

فراز کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ مگر وہ مجھے کے "میڈیا می فرائض" سے واضح طور پر "ارجع" اور "ڈنک ٹاؤ" نظر آتا تھا۔ مارے باندھے اگر کوئی کام کرتا بھی تو اس میں ضرور "سینگیناں" ڈال رہتا۔ مجھے کے سربراہ جناب احمد حسن شیخ سے اکثر کہا کرتا "شیخ صاحب! مجھے سامنے سے اخاکر کسی کو نہ کھدرے میں ڈال دیجئے!"۔۔۔ اسی کلمہ میں اس کی برطرفی کی نوبت آگئی۔ اور اس نے برطانیہ میں جا کر "مارشل لاء" کے خلاف محاذ کھول لیا۔

فراز کی حب الوطنی کے ایک مظاہرے پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ محب الوطن ہے۔ یہ نومبر ۱۹۹۳ء کی بات ہے ہم لوگ اسلام آباد کے ایک ادبی اجتماع میں کشمیر کے مسئلے پر ایک قرارداد کی حمایت میں اہل قلم کے دستخط حاصل کر رہے تھے۔ قرارداد میں کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کرتے ہوئے بھارت سے مجلس اقوام متحده کی قرارداد کے مطابق اس مسئلے کے تعینی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

فراز کے بارے میں بعض دوست متذبذب تھے۔ میں کاغذ لے کر فراز کے پاس گیا تو اس نے مجھے کھا جانے والی نظرتوں سے دیکھا۔ تقریباً چنگھاڑتے ہوئے بولا۔۔۔ "یہ کیا لکھ لائے ہو بابا۔ قراردادوں سے کچھ نہیں ہو گا میں دستخط نہیں کرتا۔" میں سمجھا وہی ہوا جس کا اندریشہ تھا۔ مگر پھر جب یہ کہتے ہوئے۔۔۔ "یہ قرارداد بڑی بے جان ہے۔ لجد معدودت خواہانہ ہے۔ ہمیں کشمیر کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ "اسرٹ" (Assert) کرنا ہو گا۔"۔۔۔ تو اس کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوا۔ وہیں ایک صاحب نے بتایا کہ فراز نے اس مسئلے پر بسمی میں Zee. T.V. پروگرام "سرحد" میں اپنے مقابل ہندوستان کے وکیلوں (سینل دت، کلڈرپ نیز، کرتاب نگہ دگل اور عارف محمد خان) کو کمری کمری نامیں۔ یہ "لال پیلا انڑویو"۔۔۔ دیکھنے سننے سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔ کہا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی حب الوطنی کے بارے میں سوئے ٹلن کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں اور اس عمل میں لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔

فراز سے بہت لوگ دراصل اس لئے بھی خفا ہیں، جن میں یہ بھی شامل رہا کہ یہ آتش فشاں کیوں ہے۔ "ایش ٹرے" (Ashtray) کیوں نہیں، "موم بچی" کیوں نہیں۔ اس کے بعض نظریات سے نظریاتی بنیادوں پر اختلاف بھی ہو تو کم از کم اس بات کا تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے مقام پر بڑی استقامت کے ساتھ کھڑا رہا۔ اور بولنے کے وقت خاموش نہیں رہا۔ ایسے

لوگوں کو---- اختلافات کے باوجود---- احترام کا خراج رہتا پڑتا ہے۔ آدمی دانت کا درد برداشت نہیں کر سکتا، لوگ فراز سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ وطن کا درد خاموشی سے برداشت کر لیتا۔ فراز کچھ ایسا صحیح نہ سی، مگر اس کی خوش تسمیٰ یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تھے۔

فراز کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نیشنل سٹرکی "ہم دفتری" کے زمانے میں ملا۔ وہ مجھے اپنا "برادر" ہی معلوم ہوا کہ گویا ملازمت کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا۔ مگر اس کو معمولات کا حیرت انگیز حد تک پابند پایا۔ اس کی دفتری تحریر کے الفاظ روشن۔ مستحکم اور دو ٹوک ہوتے۔ انگریزی کے بیچوں بیچ اردو فارسی اشعار کا ترشیخ خلک دفتری مثلوں کو ایک ادبی چاہنی بخش رہتا۔ مجھے کی "کوارٹر ماشری" میرے پرد تھی۔ دفاتر کو---- کاغذ، قلم دوات میز کر سیوں سے لیں رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ ایک مرتبہ فراز نے کچھ چیزوں طلب کیں۔ میں نے لکھ بھیجا۔

تن ہمہ داغ داغ شد
پنبہ کجا کجا نہم
فاکل پر چپڑاں کے بو اپسی ہاتھ لکھا ہوا جواب ملا

قیاس کن ز گلستان من بمار مرا

گفتگو میں اس کے چکلوں اور چھپلوں سے، جو ادب کی چاندنی سے تابدار ہوتیں، دفتر کی بساط واقعی زعفران زار نی رہتی۔ فراز کے پر رعب "مشاعراتی آوازوں" سے تو ملک بھر کے ادبی حلقة واقف ہیں مگر اس کے معركہ کے ادبی لطیفے جو دفتروں کی فاکلوں میں ہی دفن ہو گئے، ان کی برجستگی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

اس کا پہلا مشاعراتی جملہ، ہم نے ایک آباد ہی کے ملکے میں سن۔ حفیظ صاحب اپنی طویل نظم "رقاصہ" سن رہے تھے۔ نظم ختم ہونے میں نہ آئی تو ناگاہ فراز کا آوازہ ابھرا۔۔۔ "حفیظ صاحب اٹھڑواں شعر مکر ارشاد ہو" اور۔۔۔ آتائے ہوئے سامعین کے قہقہے کا کول تک گونج گئے۔۔۔ لوگ باغ حفیظ صاحب میںے تک مزاج سینر شاعر کے ساتھ اس لڑکے کی جسارت پر حیران تو ہوئے مگر اس کی شکر آفرن ذہانت پر نہال اور منون بھی ہوئے۔

اس کی گفتگو بے حد دلچسپ، نکتہ آفرنی کی ایک رنگین خوبصورت پھلوواری ہوتی ہے۔ "صحیح بات عموماً" صحیح عمل پر کہتا ہے لیکن کبھی کبھی غلط بات کو صحیح وقت پر چھوڑنے میں تاخیر بھی کر دیتا ہے۔ احمد فراز کے رومانوں کا بڑا چرچا ہے مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ دراصل اپنے آپ

سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔

فراز کی شاعری پر میں کوئی لمبی بات نہیں کروں گا۔ مجھے نقادوں کی طرح بات کرنی آتی ہی نہیں۔ مجھے تو اس کے بارے میں بنیادی طور پر یہ سیدھی بات کہنی ہے کہ ہم نے اپنے زمانے میں جن دو چار شعراء کو بچشم خود قطرے سے سمندر اور ذرے سے ”راکا پوشی“ اور ”کے ٹو“ وغیرہ بننے دیکھا ان میں احمد فراز ایک الگ تمکنت رکھتا ہے۔ اور بیکن نے فراز جیسے شاعروں ہی کے لئے کہا ہے کہ ان کی خوبصورتی ہی ان کے لئے بہترین سفارشی ذخیر ہوتی ہے۔ فنی موشاگانوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ میں یہ کہوں گا کہ فراز کی شاعری بیک وقت گلاب کا پھول بھی ہے اور آگ کا الاؤ بھی۔ صوفیا کی طرح اس کی شاعری کا پیر ہن ہلکا اور خیالات وزنی ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ آنکھ کی شاعری بھی کرتا ہے اور دماغ کی بھی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی آنکھ والی شاعری زیادہ مرغوب ہے کہ یہ درخت کی طرح۔۔۔۔۔ دل کی زمین سے اگتی۔۔۔۔۔ ذہن میں مسکتی۔۔۔۔۔ زندگی میں پھلتی اور زبانوں پر پھلتی پھولتی چلی جاتی ہے۔

اس کی شاعری زندہ دلوں سے زیادہ مردہ دلوں کے لئے ضروری ہے۔ یہ تو اتنا ای اور تنوع کے اعتبار سے۔۔۔۔۔ مختلف ذاتوں کے پانیوں کا ایک وسیع سمندر ہے اس سے پہ چلتا ہے کہ انسان کو کس دھج سے زندہ رہنا چاہئے۔

مجھے اس کی شاعری سے تسلیم نہیں ملتی۔۔۔۔۔ خواہشات میں تحریک اور تجدید کا احساس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خون میں رفتہ ”کچھ نئی چنگاریاں لشکار نے لگتی ہیں۔۔۔۔۔ اس کے فن میں نہراو نہیں۔ نہراو آئے بھی کماں سے کہ وہ تو اب اس عمر میں بھی وہی اخخارہ میں برس کا بل۔ انقلابی انڈر گریجویٹ ہے۔ نوجوان ہے، جو دماغ سے کچھ آگے ہی چلتا ہے۔ کیونکہ وہ ماضی کی تاریخ کے بجائے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی کتابوں کے مطالعہ سے نچلنے معاشرتی طبقے کے آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فراز اس کے لئے اونچے طبقے میں جگہ خالی کرو رہا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنوں پیدا کرنے پر نادر ہے۔ مصرعوں کو انگور کی بیلوں کی طرح تراشتا ہے تاکہ پھل زیادہ اترے اور ذاتیہ زیادہ ”سوادلا“ ہو۔ یہ تو اس کے فن کا اعجاز ہوا، جس نے اس کی شاعری کو شد کی طرح میثا اور چائے کی طرح تیز اور پر ہرارت کر دیا ہے۔ فکر کے اعتبار سے اس کو دنیا کے ان شعراء کی صفت میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے نئی نوع انسان کی غلامی کو کم کیا ہے۔

”عموما“ دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر شاعری میں ”حج“ زیادہ ہو تو ادب (آرٹ) کم ہو جاتا

ہے۔ مگر فراز کے کمال فن نے "جع" اور "آرٹ" دونوں کو انتہائی خوبصورتی سے شیر و شکر کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر یہ جع ہے کہ زندگی کی جنگ لفظوں سے لڑی جاتی ہے تو۔۔۔ مزاحمت اور آسودگی۔۔۔ زندگی کے دونوں محاذوں پر فراز کی پیش قدمی میں کوئی کلام نہیں۔ اس کی شاعری کا ایک رنگ کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسرا رنگ اگرچہ کام تو کرتا ہے مگر کام کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ زندگی کا فونو گرافر نہیں، مصور ہے۔ مجھے تو اس کی شاعری شبہات کا ایک مفصل سوالیہ سفر معلوم ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی اس کی وہ کلیدی انفرادیت ہے۔ جس نے فراز کی شاعری کو اس عصر کے اجتماعی شعور کا عمد نامہ بنادیا ہے۔

ایسے شعراء تو بت ہیں کہ لوگ ان کا لکھا ہوا چاؤ سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر فراز کو۔۔۔ فیض اور جالب کی طرح۔۔۔ جو بات دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کچھ ایسے کام بھی کر گیا کہ لوگ اس کو محبت سے یاد بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں میں اپنے ایک تاثر کو واضح طور پر بیان کر سکوں یا نہ کر سکوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ فراز اسی حم کی شاعری کرتا ہے جس کے لئے خود شاعری تخلیق ہوئی ہے۔ تاریخ میں اس کا شمار ان شعراء میں ہو گا۔ "جن کے دل سے" علامہ اقبال کے ایک قول کے مطابق۔۔۔ قومیں جنم لیتی ہیں۔۔۔ اس عمد کے ایک بے حد مقبول اور اتنے ہی ممتاز شاعر کی حیثیت سے فراز کی حمایت اور مخالفت میں کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ ملک میں نہ اس کے پرستاروں کا شمار ممکن ہے نہ اختلاف کرنے والوں کی کمی ہے۔۔۔ بت لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سے اختلاف بھی رکھتے ہیں اور اس کو پسند بھی کرتے ہیں۔ سو، اس تاکہر میں احمد فراز کو نہ ہمارا ادب فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہماری تاریخ۔

سید ضمیر جعفری

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء



عرضِ غم کبھی اُس کے رو برو بھی ہو جائے
شاعری تو ہوتی ہے، گفتگو بھی ہو جائے
زخمِ ہجر بھرنے سے یاد تو نہیں جاتی
کچھ نشاں تو رہتے ہیں، دل رفو بھی ہو جائے
رند ہیں بھرے بیٹھے اور مے کدھ خالی
کیا بنے جو ایسے میں ایک ”ہو“ بھی ہو جائے
میں ادھر تنِ تنا اور ادھر زمانہ ہے
وائے گر زمانے کے ساتھ، تو بھی ہو جائے

پہلی نامزادی کا دکھ کہیں برتا ہے
 بعد میں اگر کوئی شوخ تو بھی ہو جائے
 دین و دل تو کھو بیٹھے اب فراز کیا غم ہے
 کوئے یار میں غارت آبرو بھی ہو جائے



جب تجھے یاد کریں کارِ جہاں کھینچتا ہے
اور پھر عشق وہی کوہِ گراں کھینچتا ہے
کسی دشمن کا کوئی تیر نہ پہنچا مجھ تک
دیکھنا اب کے مرا دوست کمال کھینچتا ہے

عمر فرست میں کسی یارِ گذشتہ کا خیال
جب بھی آتا ہے تو جیسے رگِ جاں کھینچتا ہے

دل کے نکلوں کو کھاں جوڑ سکا ہے کوئی
پھر بھی آوازہ اُ آئینہ گراں کھینچتا ہے

انتا عشق کی کوئی نہ ہوس کی کوئی
دیکھنا یہ ہے کہ حد کون، کہاں، کھینچتا ہے

کھینچتے جاتے ہیں رسن بستہ غلاموں کی طرح
جس طرف قافلہ، عمر رواں کھینچتا ہے

ہم تو رہوارِ زیوں ہیں وہ مقدر کا سوار
خود ہی صمیمیز کرے خود ہی عنان کھینچتا ہے

رشتہ، تنگ و گلو اب بھی سلامت ہے فراز
اب بھی مقتل کی طرف دل سا جواں کھینچتا ہے



کل ہم نے بزم یار میں کیا کیا شراب پی
صحرا کی تشنگی تھی سو دریا شراب پی

اپنوں نے تج دیا ہے تو غیروں میں جا کے بیٹھ
اے خانماں خراب! نہ تنا شراب پی

تو ہم سفر نہیں ہے تو کیا سیر گستاخ
تو ہم سبو نہیں ہے تو پھر کیا شراب پی

اے دل گرفتہ، غم جاناں سبو اٹھا
اے کشته، جفائے زمانہ شراب پی

دو صورتیں ہیں یارو دردِ فراق کی
یا اُس کے غم میں ٹوٹ کے رو یا شراب پی

اک مہرباں بزرگ نے یہ مشورہ دیا
دکھ کا کوئی علاج نہیں، جا شراب پی

بادل گرج رہا تھا اُدھر محتسب اُدھر
پھر جب تملک یہ عقدہ نہ سلیحہ شراب پی

اے تو کہ تیرے در پہ ہیں رندوں کے جمگھٹے
اک روز اس فقیر کے گھر آ، شراب پی

دو جام ان کے نام بھی اے پیر میکدہ
جن رفتگاں کے ساتھ ہیشہ شراب پی

کل ہم سے اپنا یار خفا ہو گیا فراز
شاید کہ ہم نے حد سے زیادہ شراب پی



جس کے لئے ہیں جاں بلب، اس کو نہیں ملاں بھی
اے دلِ ناصبور اب عادتِ ہجر ڈال بھی
دامنِ یار تک کہاں عشقِ زیوں کی دسترس
حشمتِ حسن دیکھ کر بھول گیا سوال بھی
کب سے ہیں لوگ سر بکف، راہ میں مثلِ آہواں
اب تو مرے شکار خُو، تیر و کمال سنبھال بھی
جس کے بغیر روز و شب سخت بھی تھے محال بھی
اس کے بغیر کٹ گئے کس طرح ماہ و سال بھی

انجم و مرو مہتاب ، سرو و صنوبر و گلاب
کس سے تجھے مثال دوں، ہو تو کوئی مثال بھی

اس کے خرام ناز سے ایسی قیامتیں اٹھیں
اب کے تو مات کھا گئی چرخ کس کی چال بھی

ہم کو تو عمر کھا گئی خیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خدوخال بھی

اب کے فراز وہ ہوا جس کا نہ تھا گمان تک
پہلی سی دوستی تو کیا ختم ہے بول چال بھی



چلی ہے شر میں کیسی ہوا اداسی کی
 سبھی نے اوڑھ رکھی ہے رِدا اداسی کی
 لباسِ غم میں تو وہ اور بن گیا قاتل
 سمجھی ہے کیسی ، کسی پر قبا اداسی کی
 غزل کہوں تو خیالوں کی دھنڈ میں مجھ سے
 کرے کلامِ کوئی اپرا اداسی کی
 خیالِ یار کا بادل اگر کھلا بھی کبھی
 تو دھوپ پھیل گئی جا بجا اداسی کی

بہت دنوں سے تری یاد کیوں نہیں آئی
 وہ میری دوست مری ہمنوا اداسی کی
 فراز نے تجھے دیکھا تو کس قدر خوش تھا
 پھر اس کے بعد چلی وہ ہوا اداسی کی



کل نالہ ۽ قمری کی صد ا تک نہیں آئی
کیا ماتم گل تھا کہ صبا تک نہیں آئی

آدابِ خرابات کا کیا ذکر یہاں تو
رندوں کو بہکنے کی اوایل تک نہیں آئی

تجھے ایسے سیجا کے تعافل کا گلہ کیا
ہم جیسوں کی پُرش کو قضا تک نہیں آئی

جلتے رہے بے صرفہ، چراغوں کی طرح ہم
تو کیا، ترے کوچے کی ہوا تک نہیں آئی

کس جادہ سے گزرा ہے مگر قافلہِ عمر
آوازِ سگاں، بانگِ درا تک نہیں آئی

اس در پر یہ عالم ہوا دل کا کہ لبوں پر
کیا حرفِ تمنا کہ دعا تک نہیں آئی

دعوائے وفا پر بھی طلبِ دادِ وفا کی
اے کشتهِ غمِ تجھ کو حیا تک نہیں آئی

جو کچھ ہو فرازِ اپنے تینیں، یار کے آگے
اس سے تو کوئی بات بنا تک نہیں آئی



یہ جو سرگشته سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے
اب مہ و سال کی مہلت نہیں ملنے والی
آچکے اب تو شب و روز عذابوں والے
اب تو سب دشنه و خنجر کی زبان بولتے ہیں
اب کہاں لوگ محبت کے نصابوں والے
جو دلوں پر ہی کبھی نقب زنی کرتے تھے
اب گھروں تک چلے آئے وہ نقابوں والے

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں
فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

نہ مرے زخم کھلے ہیں نہ ترا رنگِ حنا
اب کے موسم ہی نہیں آئے گلابوں والے

یوں تو لگتا ہے کہ قسمت کا سکندر ہے فراز
مگر انداز ہیں سب خانہ خرابوں والے



ہم کہ منت کشِ صیاد نہیں ہونے کے
وہ جو چاہے بھی تو آزاد میں ہونے کے
دیکھ آ کر کبھی ان کو بھی جو تیرے ہاتھوں
ایسے اجڑے ہیں کہ آباد نہیں ہونے کے
وصفت میں اور صفتِ یار کے مضمون کے سوا
ناصحتا! تیرے سخن یاد نہیں ہونے کے
یار بد عمد کا کتنا بڑا احساں ہے کہ ہم
اب کسی کے لئے بر باد نہیں ہونے کے

اس جفا جو کو دعا دو کہ اگر وہ نہ رہا
پھر کسی سے ستم ایجاد نہیں ہونے کے

آج پھر جشن منایا گیا آزادی کا
کل گھروں پر کئی افراد نہیں ہونے کے

اتنے آرام طلب ہو تو محبت میں فراز
میر بن جاؤ گے فریاد نہیں ہونے کے



پھر تیرے نہ آنے کی خبر شام میں آئی
 زہرا ب کی تلخی سی مرے جام میں آئی
 اے کاش نہ پورا ہو کوئی بھی مرا ارمائ
 یہ اور تمنا ، دل ناکام میں آئی
 کیا کیا نہ غزل اس کی جدائی میں کسی ہے
 بربادی ۽ جاں بھی تو کسی کام میں آئی
 کچھ تیرا سرپا مرے اشعار میں اُترا
 کچھ شاعری میری ، ترے انعام میں آئی

کب تک غمِ دوراں مجھے فرماں میں رکتا
 آخر کو تو دنیا بھی مرے دام میں آئی
 کل شام کہ تھا شیخِ حرم، صاحبِ محفل
 صبا کی پری جامہء احرام میں آئی
 ہر چند فرّاز ایک فقیر سر رہ ہوں
 پرِ مملکتِ حرف مرے نام میں آئی



نہ تیرا قرب نہ بادہ ہے کیا کیا جائے
 پھر آج دکھ بھی زیادہ ہے کیا کیا جائے
 ہمیں بھی عرضِ تمنا کا ڈھب نہیں آتا
 مزاجِ یار بھی سادہ ہے کیا کیا جائے
 کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوش پھرتے ہیں
 کچھ اپنا دل بھی کشادہ ہے کیا کیا جائے
 وہ مریاں ہے مگر دل کی حرص بھی کم ہو
 طلب ، کرم سے زیادہ ہے کیا کیا جائے

نہ اس سے ترکِ تعلق کی بات کر پائیں
نہ ہدمی کا ارادہ ہے کیا کیا جائے

سلوکِ یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فرازَ
مگر یہ محققِ اعداء ہے کیا کیا جائے



میں مر مٹا تو وہ سمجھا یہ انتتا تھی مری
اسے خبر ہی نہ تھی، خاک کیما تھی مری

میں چپ ہوا تو وہ سمجھا کہ باتِ ختم ہوئی
پھر اس کے بعد تو آواز جا بجا تھی مری

جو طعنہ زن تھا مری پوشش دریدہ پر
اسی کے دوش پر رکھی ہوئی قبا تھی مری

میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں، یہی سزا تھی مری

شکست دے گیا اپنا غور ہی اس کو
 وگرنہ اس کے مقابل بساط کیا تھی مری
 کہیں دماغ کہیں دل کہیں بدن ہی بدن
 ہر اک سے دوستی یاری جدا جدا تھی مری
 کوئی بھی کوئے محبت سے پھر نہیں گزرا
 تو شیرِ عشق میں کیا آخری صدا تھی مری؟
 جو اب گھمنڈ سے سر کو اٹھائے پھرتا ہے
 اسی طرح کی تو مخلوق خاکِ پا تھی مری
 ہر ایک شعر نہ تھا در خوبِ قصیدہ دوست
 اور اس سے طبع روای خوب آشنا تھی مری
 میں اُس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فراز
 یہ زندگی سے تعارف کی ابتداء تھی مری



شیرِ محبت، هجر کا موسم، عمدِ وفا اور میں
تو تو اس بستی سے خوش خوش چلا گیا، اور میں؟

تو جو نہ ہو تو جیسے سب کو چپ لگ جاتی ہے
آپس میں کیا باتیں کرتے رات، دنیا اور میں

سیرِ چمن عادت تھی پہلے اب مجبوری ہے
تیری تلاش میں چل پڑتے ہیں باد صبا اور میں

جس کو دیکھو تیری ہوا میں پاگل پھرتا ہے
ورنہ ہم مشرب تو نہیں تھے خلقِ خدا اور میں

ایک تو وہ ہمراز مرا ہے، پھر تیرا مداح
 بس تیرا ہی ذکر کیا کرتے ہیں ضیاءُ[☆] اور میں
 ایک زمانے بعد فراز یہ شعر کئے میں نے
 اک مدت سے ملے نہیں ہیں یار مرا اور میں

☆ ضیاء الدین ضیاء



جانے نشے میں کہ وہ آفتِ جاں خواب میں تھا
جیسے اک فتنہ ۽ بیدار، رواں خواب میں تھا

وہ سرِ شام، سمندر کا کنارا، ترا ساتھ
اب تو لگتا ہے کہ جیسے یہ سماں خواب میں تھا

جیسے یادوں کا دریچہ کوئی وا رہ جائے
اک ستارہ مری جانب گمراں خواب میں تھا

جب کھلی آنکھ تو میں تھا مری تھائی تھی
وہ جو تھا قافلہ ۽ ہمسفراں خواب میں تھا

ایک شب ایک سرائے میں کمیں تھے دونوں
 میں تو سویا ہی نہیں، وہ بھی کہاں خواب میں تھا
 ایسے قاتل کو کوئی ہاتھ لگاتا ہے فراز
 شکر کر شکر کہ وہ دشمنِ جاں خواب میں تھا



نہیں کہ نامہ بروں کو تلاش کرتے ہیں
ہم اپنے بے خبروں کو تلاش کرتے ہیں

محبتوں کا بھی موسم ہے جب گذر جائے
سب اپنے اپنے گھروں کو تلاش کرتے ہیں

نا ہے کل جنہیں دستارِ افتخار ملی
وہ آج اپنے سروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ عشق کیا ہے کہ اظہارِ آرزو کے لئے
حریف، نوحہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ ہم جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں قتل گاہوں کو
در اصل چارہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

رہا ہوئے پہ عجب حال ہے اسیروں کا
کہ اب وہ اپنے پروں کو تلاش کرتے ہیں

فراز داد کے قابل ہے جستجو ان کی
جو ہم سے دربدروں کو تلاش کرتے ہیں



وہ جو آ جاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دلیں گئے خواب ہمارے لے کر
چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پڑھ گرتا ہے تو آ جاتے ہیں آرے لے کر
وہ جو آسودہ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم
اب کے موج آئی تو پلٹئے گی کنارے لے کر
ایسا لگتا ہے کہ ہر موسم ہجران میں بھار
ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر

شر والوں کو کہاں یاد ہے وہ خواب فروش
پھرتا رہتا تھا جو گلیوں میں غبارے لے کر
نقیر جاں صرف ہوا کلفتِ ہستی میں فرازَ
اب جو زندہ ہیں تو کچھ سانس ادھارے لے کر



آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی
 مریم سی وہ لُعبت بھی تو بازار کی نکلی
 دیکھو کبھی مقل کبھی گزار گئے ہے
 تصویر عجب کوچہ دلدار کی نکلی
 آنکھوں کی تسلی نہیں ہوتی تو نہ ہو وے
 ہم خوش ہیں کوئی شکل تو دیدار کی نکلی
 کیوں یار کے انکار سے افرادہ ہے اے دل
 نادان! کوئی راہ تو اقرار کی نکلی

وہ گریہ کنائ اور دلسا میں اسے دوں
کیا طرف طبیعت مرے غم خوار کی نکلی

وا رہنے دے یارب درِ توبہ کہ ابھی تو
حضرت ہی کماں تیرے گنگار کی نکلی

کل ہجر کی شب، روزِ قیامت کی طرح تھی
دن نکلا نہ جاں ہی ترے بیمار کی نکلی



کرتے بھی کیا جانا پڑا پھر سے اُسی قاتل کے پاس
 ہم بارہا ہو آئے ہیں چارہ گرانِ دل کے پاس

 کچھ بے گر کی سیپیاں کچھ بے مسافر کشتیاں
 دریا نے رخ بدلا تو کیا باقی رہا ساحل کے پاس

 جن جن کو تھا زعمِ وفا، پندارِ جاں، دعواۓ دل
 محفلِ بھی تو جمع تھے سب صاحبِ محفل کے پاس

 اس عشق و ترکِ عشق میں ناصح کہاں سے آگیا
 یہ اختیار آنکھوں کا ہے یہ فیصلہ ہے دل کے پاس

سعدی و حافظ بھی سی مند نشیانِ غزل
لیکن کلیدِ میکده ہے غالب و بیدل کے پاس

کیا خضر اور کیا راہبر حیران ہیں اس بات پر
کیوں خوش نشیں ہے قافلہ اک راندہ منزل کے پاس



کسی سے دل کی حکایت کبھی کہا نہیں کی
وگرنہ زندگی ہم نے بھی کیا سے کیا نہیں کی

ہر اک سے کون محبت نباہ سکتا ہے
سو ہم نے دوستی یاری تو کی، وفا نہیں کی

شکستگی میں بھی پنداہر دل سلامت ہے
کہ اس کے درپہ تو پہنچے مگر صد ا نہیں کی
شکافت اس کی نہیں ہے کہ اُس نے ظلم کیا
گلہ تو یہ ہے کہ ظالم نے انتہا نہیں کی

دہ نادہند اگر تھا تو پھر تقاضا کیا
کہ دل تو لے گیا قیمت مگر ادا نہیں کی

عجیب آگ ہے چاہت کی آگ بھی کہ فراز
کہیں جلا نہیں کی اور کہیں مجھا نہیں کی



مسافت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں
کوئی بھی خواب ہو تعمیر گھر کی دیکھتے ہیں

وطن سے دور بھی آزادیاں نصیب کے
قدم کمیں بھی ہوں زنجیر گھر کی دیکھتے ہیں

اگرچہ جسم کی دیوار گرنے والی ہے
یہ سادہ لوح کہ تعمیر گھر کی دیکھتے ہیں

کوئی تو زخم اسے بھولنے نہیں دلتا
کوئی تو یاد عنال گیر، گھر کی دیکھتے ہیں

ہم ایسے خانہ بر انداز، کنج غربت میں
جو گھر نہیں تو تصاویر گھر کی دیکھتے ہیں

بنائے دل ہے کسی خوابگاہ ززلہ پر
سو اپنی آنکھوں سے تقدیر گھر کی دیکھتے ہیں

فراز جب کوئی نامہ وطن سے آتا ہے
تو حرف حرف میں تصویر گھر کی دیکھتے ہیں



وہشیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ

ہم نے اک عمر بسر کی ہے غم یار کے ساتھ
میر دو دن نہ جئے ہجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر عزتِ سادات بھی دستار کے ساتھ

اس قدر خوف ہے اب شر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

ایک تو خواب لئے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
 اس پر تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ
 شر کا شر ہی ناصح ہو تو کیا کیجئے گا
 ورنہ ہم رند تو بھڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ
 ہم کو اس شر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
 لوگ معمدار کو چُن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ
 جو شرف ہم کو ملا کوچہ ۶ جاناں سے فراز
 سوئے مقل بھی گئے ہیں اسی پندار کے ساتھ



تیرا غم اپنی جگہ دنیا کے غم اپنی جگہ
 پھر بھی اپنے عمد پر قائم ہیں ہم اپنی جگہ
 کیا کریں یہ دل کسی کی ناصحا سنتا نہیں
 آپ نے جو کچھ کہا اے محترم، اپنی جگہ
 ہم موحد ہیں بتوں کے پونے والے نہیں
 پر خدا لگتی کہیں تو وہ صنم اپنی جگہ
 یا بے پروا! کبھی ہم نے کوئی شکوہ کیا
 ہاں مگر ان ناپاس آنکھوں کا نم اپنی جگہ
 محفلِ جانان ہو، مقل ہو کہ میخانہ فرآز
 جس جگہ جائیں بنا لیتے ہیں ہم اپنی جگہ



کیوں طبیعت کیسیں ٹھرتی نہیں
دوستی تو اُداس کرتی نہیں

ہم ہمیشہ کے سر چشم سی
تجھ کو دیکھیں تو آنکھ بھرتی نہیں

شب ہجراں بھی روزِ بد کی طرح
کٹ تو جاتی ہے پر گزرتی نہیں

شعر بھی آیتوں سے کیا کم ہیں
ہم پہ مانا وحی اترتی نہیں

اس کی رحمت کا کیا حساب کریں
بس ہمیں سے حساب کرتی نہیں

یہ محبت ہے، سن! زمانے سن!
اتنی آسانیوں سے مرتی نہیں

جس طرح تم گزارتے ہو فرازَ
زندگی اس طرح گزرتی نہیں



اس کی نوازشوں نے تو حیران کر دیا
 میں میزان تھا مجھے مہمان کر دیا
 اک نوبھارِ ناز کے ہلکے سے لمس نے
 میرے تو سارے جسم کو گلدان کر دیا
 کل اک نگارِ شرِ سبانے بے لطفِ خاص
 مجھ سے فقیر کو بھی سلیمان کر دیا
 جیسے سے اس قدر بھی لگاؤ نہ تھا مجھے
 تو نے تو زندگی کو، مری جان کر دیا

قریب کے پل وہ اتنا سخنی تھا کہ اس نے تو
پورا تمام عمر کا نقصان کر دیا

نا آشناۓ لطفِ تصادم کو کیا خبر
میں نے ہوا کی زد پہ رکھا جان کر، دیا

اتنے سکون کے دن کبھی دیکھے نہ تھے فراز
آسودگی نے مجھ کو پریشان کر دیا



اک شام ہے انتظار جیسی
 اک یاد ہے یاد یار جیسی
 اک درد سے نخلِ جاں چراغاں
 اک آگ سی ہے چنار جیسی
 اک زخم گلاب سا کھلا ہے
 اک دکھ کی چھپن ہے خار جیسی
 اک نقش ہے وہم کی طرح کا
 اک شکل ہے اعتبار جیسی
 اک روپ کہ آئینہ ترخ جائے
 اک دُھوپ رخ نگار جیسی

اک راہ گزر ہے آسمان تک

اک کاپکشاں غبار جیسی

اک هجر کا روگ عمر بھر کا

اک عمر کہ ہے ادھار جیسی

اک خواب کہ کچھ سمجھنہ آئے

اک دھند ہے کوہسار جیسی

اک لعبت سنگ، سر بہ زانو

اک زلف ہے آبشار جیسی

اک ساز لبو اگل رہا ہے

اک طرزِ فغاں ستار جیسی

اک شعلہ، حُسن جل بجھا ہے

اک آنکھ ہے شرمدار جیسی

اک شاخ پہ چپ اُواس قمری

اک نغمہ سرا ہزار جیسی

اک گیت پہاڑیوں کا جھرنا
اک چنخ لبو کی دھار جیسی

اک تیر کہ دل میں ہے ترازو
اک تنغ جگر کے پار جیسی

اک وعدہ ۽ دوست حرف عیسیٰ
اک ساعتِ صبر دار جیسی

اک حلقہ ۽ رنگ طوق آسا
اک قوسِ قزح حصار جیسی

ایک ایک شعاع نوکِ نشر
ایک ایک کرن کثار جیسی

اک باغِ مراد اُجڑ رہا ہے
اک دھوم سی ہے بمار جیسی

اک عمد فراز جی کے دیکھا
اک رت بھی نہ آئی پیار جیسی



لگتا ہے کہ اب چاہتیں آسائیں زیادہ
 عُشاق ہیں کم، چاک گریباں ہیں زیادہ
 اک آدھ کوئی صاحبِ دل بھی ہے فروکش
 اب کوچھ دلدار میں دربار ہیں زیادہ
 مدت سے کوئی جانبِ مقتل نہیں آیا
 قاتل بھی توقع سے پشیماں ہیں زیادہ
 جس تاج کو دیکھو وہی سکھلول نما ہے
 اب کے تو فقیروں سے بھی سلطان ہیں زیادہ

ہر ایک کو دعویٰ ہے یہاں چارہ گری کا
اب دل کے اُجڑ جانے کے امکاں ہیں زیادہ

کیا کیا نہ غزل اس کی جدائی میں کھی ہے
ہم پر شبِ ہجراء ترے احساں ہیں زیادہ

لوگوں نے تو جو زخم دیئے تھے سو دیئے تھے
کچھ تیرے کرم ہم پر مری جاں ہیں زیادہ

مشاطہِ دنیا سے کہے کون فرّاز اب
ہم یار کی زلفوں سے پریشاں ہیں زیادہ



ہم اہلِ دل کو بھی کردار کیا دیے گئے ہیں
کہ زخم کھاتے گئے ہیں، دعا دیے گئے ہیں

ہم اپنی آبلہ پائی پ منفعل تو نہیں
جو تیزرو تھے انہیں راستا دیے گئے ہیں

کھاں سے حوصلہ لاتے پیغمبروں جیسا
سو کیا یہ کم ہے کہ شاعر بنا دیے گئے ہیں

جمانِ عشق سے کیا دل سا تاجدار گیا؟
جو شہرِ درد کے پرچم جھکا دیے گئے ہیں

تو کیا کوئی بھی تعلق نہیں رہا باقی
 تو کیا وہ جتنے دیے تھے بجھا دیے گئے ہیں
 سو شرِ علم کا کیا حال اب کہیں کہ وہاں
 محبتوں کے صحافے جلا دیے گئے ہیں
 نئے زمانے میں آتے رہیں گے لوگ نئے
 ہمارے نقش قدم بھی مٹا دیے گئے ہیں



کل پُرشِ احوال جو کی یار نے میرے
 کس رشک سے دیکھا مجھے غم خوار نے میرے
 بس ایک ترا نام چھپانے کی غرض سے
 کس کس کو پکارا دل بیمار نے میرے
 یا گرمی بازار تھی یا خوف زیاد تھا
 پھر پچ دیا مجھ کو خریدار نے میرے
 ویرانی میں بڑھ کر تھے بیابان سے تو پھر کیوں
 شرمندہ کیا ہے در و دیوار نے میرے
 جب شاعری پرده ہے فراز اپنے جنوں کا
 پھر کیوں مجھے رسوا کیا اشعار نے میرے



منزلیں ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں
 مختلف ہو کے بھی سب زندگیاں ایک سی ہیں
 کوئی قاصد ہو کہ ناصح، کوئی عاشق کہ عدو
 سب کی اس شوخ سے واستگیاں ایک سی ہیں
 دشتِ مجنوں نہ سی تیشہ ۶ فرہاد سی
 سفرِ عشق میں واماندگیاں ایک سی ہیں
 یہ الگ بات کہ احساس جدا ہوں ورنہ
 راحتیں ایک سی، افسردگیاں ایک سی ہیں

صوفی و رند کے ملک میں سی لاکھ تضاد
 متیاں ایک سی، وارنگیاں ایک سی ہیں
 وصل ہو، ہجر ہو، قربت ہو کہ دوری ہو فراز
 ساری کیفیتیں، سب تشنگیاں ایک سی ہیں



چلو کہ کوچھ ا دلدار چل کے دیکھتے ہیں
 کے کے ہے یہ آزار چل کے دیکھتے ہیں
 نا ہے ایسا مسیحا کہیں سے آیا ہے
 کہ اس کو شر کے بیمار چل کے دیکھتے ہیں
 ہم اپنے بت کو، نیخا لئے ہے یوسف کو
 ہے کون رونق بازار چل کے دیکھتے ہیں
 نا ہے دیر و حرم میں تو وہ نہیں ملتا
 سواب کے اس کو سردار چل کے دیکھتے ہیں

اس ایک شخص کو دیکھو تو آنکھ بھرتی نہیں
اس ایک شخص کو ہر بار چل کے دیکھتے ہیں

وہ میرے گھر کا کرے قصد جب تو سائے سے
کئی قدم در و دیوار چل کے دیکھتے ہیں

فراز اسیر ہے اس کا کہ وہ فراز کا ہے
ہے کون؟ کس کا گرفتار؟ چل کے دیکھتے ہیں



یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم
چارہ گر روئیں گے اور غم خوار بن جائیں گے ہم

ہم سر چاکِ وفا ہیں اور ترا دستِ ہنر
جو بنا دے گا ہمیں اے یار، بن جائیں ہم

کیا خبر تھی اے نگارِ شعر، تیرے عشق میں
دلبرانِ شر کے دلدار بن جائیں گے ہم

سخت جاں ہیں پر ہماری اُستواری پر نہ جا
ایے ٹوٹیں گے ترا اقرار بن جائیں گے ہم

اور کچھ دن بیٹھنے دو کوئے جانال میں ہمیں
رفتہ رفتہ سایہ ۽ دیوار بن جائیں گے ہم
اس قدر آسال نہ ہو گی ہر کسی سے دوستی
آشنائی میں ترا معیار بن جائیں گے ہم
میر و غالب کیا کہ بن پائے نہیں فیض و فراق
زعم یہ تھا رومی و عطّار بن جائیں گے ہم
دیکھنے میں شاخِ گل لگتے ہیں لیکن دیکھنا
دستِ چلچیں کے لئے تکوار بن جائیں گے ہم
ہم چراغوں کو تو تاریکی سے لڑنا ہے فراز
گل ہوئے پر صبح کے آثار بن جائیں گے ہم



غزل سن کر پریشان ہو گئے کیا
 کسی کے دھیان میں تم کھو گئے کیا
 یہ بیگانہ روی پہلے نہیں تھی
 کو تم بھی کسی کے ہو گئے کیا
 نہ پوشرش کونہ سمجھانے کو آئے
 ہمارے یار ہم کو رو گئے کیا
 ابھی کچھ دیر پہلے تک یہیں تھے
 زمانہ ہو گیا تم کو گئے کیا

کسی تازہ رفاقت کی للک ہے
پرانے زخم اچھے ہو گئے کیا

پلٹ کر چارہ گر کیوں آ گئے ہیں
شبِ فرقت کے مارے سو گئے کیا

فراز اتنا نہ اڑا حوصلے پر
اسے بھولے زمانے ہو گئے کیا



دو گھونٹ کیا پئے کہ بدن میں لگی ہے آگ
 ساقی! شراب ہے کہ سبو میں بھری ہے آگ
 تقدیر ہس رہی ہے کہ میں سوختہ نصیب
 جنگل میں آگیا ہوں جو گھر میں لگی ہے آگ
 جو ڈھونڈتے تھے آگ انیں پیغمبری ملی
 ہم کو پیغمبری کی طلب تھی، ملی ہے آگ
 اب باغ و باغبان سے کوئی کیا گلہ کرے
 اب کے تو رنگِ گل سے چمن میں لگی ہے آگ

جاناں ہم اہل درد کی تر چشمگی نہ دیکھ
داماں کو دور رکھ کہ دلوں میں چھپی ہے آگ

محفل کو کیا خبر جو ہمارے دلوں میں ہے
کب شمع ساں ہمارے سروں پر دھری ہے آگ

آتش بجاں ہیں کب سے محبت میں ہم فراز
اک بار جب لگی ہے تو پھر کب بُجھی ہے آگ



جو بھی قاصد تھا وہ غیروں کے گھروں تک پہنچا
کوئی نامہ نہ ترے در بدروں تک پہنچا

مجھ کو مٹی کیا تو نے تو یہ احسان بھی کر
کہ مری خاک کو اب کُوزہ گروں تک پہنچا

اے خدا! ساری مسافت تھی رفاقت کے لئے
مجھ کو منزل کی جگہ همفوں تک پہنچا

تو مہ و مہر لئے ہے مگر اے دستِ کرم
کوئی جگنو بھی نہ تاریک گھروں تک پہنچا

دل بڑی چیز تھا بازارِ محبت میں کبھی
اب یہ سودا بھی مری جان، سروں تک پہنچا

وقت قاروں کو بھی محتاج بنا دیتا ہے
وہ شہرِ حُسن بھی دریوزہ گروں تک پہنچا

اتنے ناصح ملے رستے میں کہ توبہ توبہ
بڑی مشکل سے میں شوریدہ سروں تک پہنچا

اہل دنیا نے بجھی کو نہیں لوٹا ہے فرائز
جو بھی تھا صاحبِ دل، مفت بروں تک پہنچا



عاشقی بے دلی سے مشکل ہے
پھر محبت اُسی سے مشکل ہے

عشق آغاز ہی سے مشکل ہے
صبر کرنا ابھی سے مشکل ہے

ہم تن آسان ہیں اور ہمارے لئے
دشمنی، دوستی سے مشکل ہے

جس کو سب بے وفا سمجھتے ہوں
بے وفائی اسی سے مشکل ہے

ایک کو دوسرے سے سمل نہ جان
ہر کوئی، ہر کسی سے مشکل ہے

تو بضد ہے تو جا فراز مگر
واپسی اُس گلی سے مشکل ہے



ملول کر ہمیں اتنا ملول کر جانا
کہ ہم نہ یاد کریں تجھ کو بھول کر جانا

ہیں مثلِ نامہ ہے بے نام، دستِ قاصد میں
سو ہم سے در بدروں کو وصول کر جانا

پھر آگئے ترے کوچے میں خوش نگاہ ترے
غم جہاں کی صلیبوں پہ جھول کر جانا

کبھی تو دستِ حنائی سے سرخی ہے لب سے
ہمارے زخم تمنا کو پھول کر جانا

غزل بہان کروں

یہ اہلِ درد تریِ مملکت میں رہتے ہیں
سو تو خراجِ دلوں کے قبول کر جاناں

چلو وہ ترکِ تعلق کا فیصلہ ہی سی
سو اختیار کوئی تو اصول کر جاناں

فرازَ تجھ کو خداوند مانتا ہے، اسے
دیارِ عشق میں اپنا رسول کر جاناں



دل ٹھرنے دے تو آنکھیں بھی جھپکتے جاویں
ہم کہ تصوری بنے بس تجھے تکتے جاویں

چوب نم خورده کی مانند سلگتے رہے ہم
نا تو بُجھ پائیں نہ بھڑکیں نہ دہلتے جاویں

تیری بستی میں ترا نام پتہ کیا پوچھا
لوگ حیران و پریشان ہمیں تکتے جاویں

کیا کرے چارہ کوئی جب ترے اندوہ نصیب
منہ سے کچھ بھی نہ کمیں اور سکتے جاویں

کوئی نشے سے کوئی تشنہ لبی سے ساقی
تری محفل میں بھی لوگ بہکتے جاویں

مزدہ وصل سے کچھ ہم ہی ز خود رفتہ نہیں
اس کی آنکھوں میں بھی جگنو سے چمکتے جاویں

کبھی اس یارِ سمن بر کے سخن بھی سنیو
ایسا لگتا ہے کہ غنچے سے چٹکتے جاویں

ہم نوا سنجِ محبت ہیں ہر اک رُت میں فراز
وہ قفس ہو کہ گلتاں ہو، چمکتے جاویں



ہیں زخم بہت اور بھی دل پر مرے آگے
کوئی نہ کہے اس کو ستمگر مرے آگے

آفات زمانے کے تعاقب میں مرے ہیں
اور مے ہے نہ مینا ہے نہ ساغر مرے آگے

کیوں بگڑوں فرشتوں کے لکھے پر کہ یہی کھیل
ہوتا رہا دنیا میں بھی اکثر مرے آگے

تو ساتھ چمن میں ہو تو پھر رشک کے مارے
پھرتے ہیں کئی سرو و صنوبر مرے آگے

صیاد نے پلے تو رہائی کی خبر دی
پھر ڈال دیئے اس نے مرے پر مرے آگے

گو تیرہ مقدر ہوں مگر کیسی شکایت
ہیں کانچ کے نکڑے مہ و اختر مرے آگے

مگر اہ زمانہ ہوں مگر راہ وفا میں
پوچھئے نہ خضر کو بھی سکندر مرے آگے

وہ صاحبِ دل ہوں کہ مری جان کا دشمن
تعظیم سے رکھ دیتا ہے خخبر مرے آگے

وہ مستِ ازل ہوں کہ مرا کاتبِ تقدیر
لکھتا ہے مری لوحِ مقدر مرے آگے

وہ حرفِ صداقت ہوں کہ ہر عہدِ ستم میں
ہے ساغرِ سم قندِ مگر مرے آگے

اے داورِ محشر نہ مری فردِ عمل دیکھ
اے ہاتفِ غیبی نہ سخن کر مرے آگے

اک ذرہ ۽ روزن ہے مرے واسطے خورشید
 اک ریزہ ۽ بینا ہے سمندر مرے آگے
 میں نے بھی کیا قصد سفر کا کہ غزل میں
 غالب سا طرحدار ہے رہبر مرے آگے
 کس اسم کی برکت ہے کہ ایوانِ سخن میں
 کھلتا ہی چلا جاتا ہے ہر در مرے آگے



کل شب تھا عجب دید کا منظر مرے آگے
دنیا تھی نہ ہونے کے برابر مرے آگے

جیسے متلاطم ہو سمندر مرے اندر
جیسے ہو کوئی ماہ منور مرے آگے

اس وقت نہ تھی آنکھ جھپکنے کی بھی فرصت
اک شہر طسمات تھا یکسر مرے آگے

اس وقت نہ تھا دل کو دھڑکنے کا بھی یارا
اک عالم حیرت تھا سراسر مرے آگے

خدام بہرگام لئے جام ستادہ
لب بستہ کنیزانِ سمن بر مرے آگے

لائے کوئی مینائے مئے تند لپک کر
رکھ دے کوئی تعظیم سے ساغر مرے آگے

چھپ چھپ کے کوئی چست کرے ٹنگ قبا کو
ہنس ہنس کے اتارے کوئی زیور مرے آگے

اک مست ادا کاکل مشکیں کو بکھیرے
لے آئی دف و چنگ اٹھا کر مرے آگے

جیسے ہو مرے سامنے شدّاد کی جنت
جیسے ہو صنم خانہ ۽ آذر مرے آگے

جیسے کوئی گل چہرہ پری چھم سے اتر آئے
اور رقص کرے ناز سے آکر مرے آگے

شعلہ سا بدن زلف کی محمل میں لپیٹئے
جیسے ہو کوئی خواب سا پیکر مرے آگے

یوں جیسے کہ جادو سا جگاتا چلا جائے
اک آفت جاں فتنہ ۽ محشر مرے آگے

یا قوت سے لب سرو سا قد رات سی آنکھیں
وہ جانِ قیامت تھی میرے گھر میرے آگے

وہ کیفیتِ دل تھی کہ بہزاد کا فن کیا
حافظ کی غزل بھی تھی فرود تر میرے آگے

اے گردشِ دوراں ذرا آہستہ قدم رکھ
یہ ساعتِ گزرال ہے گھڑی بھر میرے آگے

اے موسمِ ہجراءں ابھی کچھ دیر توقف
آنا ہے تو آ جانا ٹھہر کر میرے آگے

آسودگی، قرب کی اعضا شکنی سے
ہے نیند میں غافل مرا دلبر میرے آگے

اے صبحِ جدائی ابھی رک جا کہ سنگر
ایسے بھی نہ جذگے تھے مقدر میرے آگے

شائد کہ فرماز آج کسی روپِ نگر سے
آئی ہے قضا بھیں بدل کر میرے آگے



نہ شب و روز ہی بد لے ہیں نہ حال اچھا ہے
 کس برمیں نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

 ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے، جانتے ہیں
 دامِ دنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے

 میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تعافل کب تک؟
 مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

 دل نہ مانے بھی تو ایسا ہے کہ گاہے گاہے
 یا رہ بے فیض سے ہلکا سا ملال اچھا ہے

لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

رہروانِ رہِ الفت کا مقدر معلوم
ان کا آغاز ہی اچھا نہ ملک اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ، پر یہ حقیقت ہے فراز
تیری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے



دشتِ افرادہ میں اک پھول کھلا ہے سو کھاں
وہ کسی خوابِ گریزاں میں ملا ہے سو کھاں

ہم نے مدت سے کوئی ہجو نہ وا سوخت کی
وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان سے گلہ ہے سو کھاں

ہم تری بزم سے اٹھے بھی تو خالی دامن
لوگ کہتے ہیں کہ ہر دکھ کا صلہ ہے سو کھاں

آنکھ اسی طور برستی ہے تو دل رستا ہے
یوں تو ہر زخم قرینے سے سلا ہے سو کھاں

بارہا کوچھے ۽ جاناں سے بھی ہو آئے ہیں
ہم نے مانا کہیں جنت بھی دلا ہے سو کھاں

جلوہ ۽ دوست بھی دھنلا گیا آخر کو فرماز
ورنہ کہنے کو تو غم، دل کی جلا ہے سو کھاں



ہم بھی مانگیں مراد ہو کچھ تو
جب رہا تیرے بعد ہو کچھ تو

کیسے پیاں کھاں کے قول و قرار
اُس ستمگر کو یاد ہو کچھ تو

کفر ہے ' بے جواز مے پینا
تو ہو یا ابر و باد ' ہو کچھ تو

کیوں ابھی سے گلہ تعافل کا
ملنا جلنا زیاد ہو کچھ تو

آؤ رو لیں فراز دنیا کو
خوش دل نامراد ہو کچھ تو



کچھ ہمیں اس سے جان کر نہ کھلے
 ہم یہ سب بھید نہے وگرنہ کھلے

 جی میں کیا کیا تھی حست پرواز
 جب رہائی ملی تو پر نہ کھلے

 آگے خواہش تھی خون رونے کی
 اب یہ مشکل کہ چشم تر نہ کھلے

 ہو تو ایسی ہو پردہ داری ۽ زخم
 حال دل کا بھی آنکھ پر نہ کھلے

سخت تنا تھے اس کی بزم میں ہم
رنگِ محفل کو دیکھ کر نہ کھلے

کتنے خوش ہو فرازِ اسیری پر
اور یہ بندِ غم اگر نہ کھلے؟



وحشتِ دل ، طلبِ آبلہ پائی لے لے
 مجھ سے یارب! مرے لفظوں کی کمائی لے لے
 عقل ہر بار دکھاتی تھی جلے ہاتھ اپنے
 دل نے ہر بار کہا، آگ پرائی لے لے
 میں تو اس صبح درخشاں کو تو نگر جانوں
 جو مرے شر سے کشکول گدائی لے لے
 تو غنی ہے مگر اتنی ہیں شرائط تیری
 وہ محبت جو ہمیں راس نہ آئی لے لے

ایسا نادان خریدار بھی کوئی ہو گا
 جو ترے غم کے عوض ساری خدائی لے لے
 اپنے دیوان کو گلیوں میں لیے پھرتا ہوں
 ہے کوئی جو ہنرِ زخم نمائی لے لے
 میری خاطر نہ سی اپنی انا کی خاطر
 اپنے بندوں سے تو پندارِ خدائی لے لے
 اور کیا نذر کروں اے غمِ ولدارِ فراز
 زندگی جو غمِ دنیا سے بچائی لے لے



چشمِ گریاں میں وہ سیلاں تھے اے یار کے بس
 گرچہ کہتے رہے مجھ سے مرے غم خوار کے بس
 گھر تو کیا گھر کی شاہت بھی نہیں ہے باقی
 ایسے دیران ہوئے ہیں در و دیوار کے بس
 زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقہ تیری
 ایک اک سانس نے وہ وہ دیے آزار کے بس
 اس سے پلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
 ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اس بار کے بس

اب وہ پہلے سے بلا نوش و یہ مست کھاں
 اب تو ساقی سے یہ کہتے ہیں قدح خوار کہ بس
 لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فراز
 ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس



اتنے بھی تو وہ خفا نہیں تھے
 جیسے کبھی آشنا نہیں تھے
 مانا کہ بہم کماں تھے ایسے
 پر یوں بھی جدا جدا نہیں تھے
 تھی جتنی بساط ، کی پرستش
 تم بھی تو کوئی خدا نہیں تھے
 حد ہوتی ہے طزر کی بھی آخر
 ہم تیرے نہیں تھے، جا نہیں تھے

کس کس سے نباتے رفاقت
ہم لوگ کہ بے وفا نہیں تھے

رخصت ہوا وہ تو میں نے دیکھا
پھول اتنے بھی خوشنا نہیں تھے

تھے یوں تو ہم اس کی انجمن میں
کوئی ہمیں دیکھتا، نہیں تھے

جب اس کو تھا مان خود پہ کیا کیا
تب ہم بھی فرّاز کیا نہیں تھے



تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے
ہم نواگر، خوش رہے جیسے بھی حالوں میں رہے
اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جس طرح تسلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے
دیکھنا اے رہ نورِِ شوق! کوئے یار تک
کچھ نہ کچھ رنگِ حنا پاؤں کے چھالوں میں رہے
ہم سے کیوں مانگے حابِ جاں کوئی جب عمر بھر
کون ہیں، کیا ہیں، کہاں ہیں؟ ان سوالوں میں رہے

بد ظنی ایسی کہ غیروں کی وفا بھی کھوٹ تھی
سوئے ظن ایسا کہ ہم اپنوں کی چالوں میں رہے

ایک دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
یار مکتب کی کتابوں کے حوالوں میں رہے

عشق میں دنیا گنوائی ہے نہ جاں دی ہے فراز
پھر بھی ہم اہل محبت کی مثالوں میں رہے



شعار اپنا ہی جس کا بہانہ سازی تھا
 وہ میرے جھوٹ سے خوش تھا نہ پچ پر راضی تھا
 تمام عمر اسی کے رہے یہ کیا کم ہے
 بلا سے عشق حقیقی نہ تھا مجازی تھا
 یہ دو دلوں کی قربت بڑی گواہی ہے
 سو کیا ہوا کوئی شاہد نہ کوئی قاضی تھا
 نہ طفر کر کہ کئی بار کہہ چکا تجھ سے
 وہ میری پہلی محبت تو میرا ماضی تھا

نہ دوست یار، نہ ناصح، نہ نامہ بر، نہ رقیب
بلا کشانِ محبت سے کون راضی تھا

یہ گل شدہ سی جو شمعیں دکھائی دیتی ہیں
ہر ان آنکھوں کا آگے ستارہ سازی تھا

عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا
کوئی فراز سا کافر نہیں تھا غازی تھا



یوں دل سے کسی درد کا پیاں نہیں کرتے
 اب جاں پہ بنی بھی ہے تو درماں نہیں کرتے
 ہر یاد کو یوں زخم بناتے نہیں دل کا
 ہر تیر کو پیوستِ رگِ جاں نہیں کرتے
 یہ مسئلہ اب اہلِ محبت کا ہے اپنا
 مرتے ہیں تو کچھ آپ پہ احساں نہیں کرتے
 خط لائیں نہ لاائیں ترا، ہم نامہ بروں کو
 بس دیکھتے رہتے ہیں پریشان نہیں کرتے

ایسا بھی تو رکھتے نہیں خنجر پہ گلو کو
اتنا بھی تو قاتل کو پشیاں نہیں کرتے

کب شمعیں جلاتا ہے شبِ ماہ میں کوئی
تو آئے تو ہم گھر میں چراغاں نہیں کرتے

لوگوں کو گماں تک نہیں ہوتا ہے جنوں کا
ہم دل کی طرح چاک گریباں نہیں کرتے

ہم تج کے چلے آتے ہیں یارو درِ جاناں
 غالب کی طرح منت درباں نہیں کرتے



دل سلگتا ہے مگر سوختہ جانی کم ہے
شعر کیا ہوں کہ طبیعت میں روائی کم ہے

زیست اک آدھ محبت سے بسر ہو کیسے؟
رات لمبی ہو تو پھر ایک کہانی کم ہے

تجھ سے کہنا تو نہیں چاہیے پر کہتے ہیں
ہم نے بھی دولتِ جاں اب کے لٹانی کم ہے

دل کو کیا روئیں کہ جب سوکھ گئی ہوں آنکھیں
شر ویراں ہے کہ دریاؤں میں پانی کم ہے

ہم نے اندوہ زمانہ سے نہ خم کھایا تھا
شائد اب یوں ہے کہ آشوبِ جوانی کم ہے

جس طرح سانحے گزرے ہیں تری جاں پہ فراز
اس کو دیکھیں تو یہ آشقتہ بیانی کم ہے



جو چل سکو تو کوئی ایسی چال چل جانا
مجھے گماں بھی نہ ہو اور تم بدل جانا
یہ شعلگی ہو بدن کی تو کیا کیا جائے
سو لازمی تھا ترے پیر،ن کا جل جانا
تمہیں کرو کوئی درماں، یہ وقت آ پہنچا
کہ اب تو چارہ گروں کو بھی ہاتھ مل جانا
ابھی ابھی تو جدائی کی شام آئی تھی
ہمیں عجیب لگا زندگی کا ڈھل جانا

بھی سجائی ہوئی موت زندگی تو نہیں
مُورخوں نے مقابر کو بھی محل جانا

یہ کیا کہ تو بھی اسی ساعتِ زوال میں ہے
کہ جس طرح ہے بھی سورجوں کو ڈھل جانا

ہر ایک عشق کے بعد اور اس کے عشق کے بعد
فرازَ اتنا بھی آسان نہ تھا سنبھل جانا



اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
 اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا
 ڈھلتی نہ تھی کسی بھی جتن سے شبِ فراق
 اے مرگِ ناگہاں! ترا آنا بہت ہوا
 ہم خلد سے نکل تو گئے ہیں پر اے خدا!
 اتنے سے واقعہ کا فسانہ بہت ہوا
 اب ہم ہیں اور سارے زمانے کی دشمنی
 اس سے ذرا سا ربط برمھانا بہت ہوا

اب کیوں نہ زندگی پے محبت کو وار دیں
اس عاشقی میں جان سے جانا بہت ہوا

اب تک تو دل کا دل سے تعارف نہ ہو سکا
مانا کہ اس سے ملنا ملانا بہت ہوا

کیا کیا نہ ہم خراب ہوئے ہیں مگر یہ دل
اے یاد یار تیرا ٹھکانہ بہت ہوا

کہتا تھا ناصحوں سے مرے منہ نہ آئیو
پھر کیا تھا ایک ”ہو“ کا بہانہ بہت ہوا

لو پھر ترے لبوں پے اسی بے وفا کا ذکر
احمد فراز! تجھ سے کہا نا، بہت ہوا



ہم سنائیں تو کہانی اور ہے
یار لوگوں کی زبانی اور ہے
چارہ گر روتے ہیں تازہ زخم کو
دل کی بیماری پرانی اور ہے
جو کہا ہم نے وہ مضمون اور تھا
ترجمان کی ترجمانی اور ہے
ہے بساطِ دل لہو کی ایک بوند
چشم پرخُوں کی روائی اور ہے

نامہ بر کو کچھ بھی ہم پیغام دیں
داستاں اس نے سنائی اور ہے

آپ زمزم دوست لائے ہیں عبث
ہم جو پیتے ہیں وہ پانی اور ہے

سب قیامت قامتوں کو دیکھ لو
کیا مرے جاناب کا ثانی اور ہے؟

اہلِ دل کی انجمن میں آ کبھی
ان کی دنیا یار جانی اور ہے
شاعری کرتی ہے اک دنیا فراز
پر تری سادہ بیانی اور ہے



نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہمس کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ترے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
یہ سیرچشم مگر کب اوہر کو دیکھتے ہیں

عجب فونِ خریدار کا اثر ہے کہ ہم
اُسی کی آنکھ سے اپنے ہنر کو دیکھتے ہیں

کوئی مکاں کوئی زندگی سمجھ کے رہتا ہے
طلسم خانہ و دیوار و در کو دیکھتے ہیں

فراز در خورِ سجدہ ہر آستانہ نمیں
ہم اپنے دل کے حوالے سے در کو دیکھتے ہیں

وہ بے خبر مری آنکھوں کا صبر بھی دیکھیں
جو طزر سے مرے دامانِ تر کو دیکھتے ہیں

یہ جاں کنی کی گھڑی کیا ٹھہر گئی ہے کہ ہم
کبھی قضا کو کبھی چارہ گر کو دیکھتے ہیں

ہماری در بدرا کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

فراز ہم سے سخنِ دوست، فال کے لئے بھی
کلامِ غالبِ آشفۂ سر کو دیکھتے ہیں



گل بھی گلشن میں کماں غنچہ دہن تم جیسے
 کوئی کس منه سے کرے تم سے سخن، تم جیسے
 یہ مرا حسنِ نظر ہے تو دکھا دے کوئی
 قامت و گیسو و رخار و دہن تم جیسے
 اب تو قاصد سے بھی ہر بات جھجک کر کہنا
 لے گئے ہو مرا بے ساختہ پن تم جیسے
 اب تو نایاب ہوئے دشمن دیرینہ تک
 اب کماں اے مرے یاراں کمن، تم جیسے؟

کبھی ہم پر بھی ہو احساں کے بنا دیتے ہو
 اپنی آمد سے بیباں کو چمن تم، جیسے
 کبھی ان لالہ قباوں کو بھی دیکھا ہے فرازَ
 پنے پھرتے ہیں جو خوابوں کے کفن تم جیسے



کبھی جو راحتِ جاں تھا اسے بھلا بھی دیا
 اگرچہ دل نے ہمیں طعنہ وفا بھی دیا

 نہیں کہ ہم سفروں کے لئے بنے دیوار
 جو برق پا تھے انہیں ہم نے راستا بھی دیا

 مگر خدا کی سبھی خشیش انوکھی ہیں
 وفا کے ساتھ ہمیں یار بے وفا بھی دیا

 میں بت بنا اسے دیکھا کیا تو اُس نے کہا
 گزر چکی ہے بہت رات اب بجھا بھی، دیا

 فراز جس نے دلوں کو اداسیاں بخشیں
 اسی نے زخم چھپانے کا حوصلہ بھی دیا



اشک تعبیر اور خواب نہی
 درد دریا ہے اور سراب نہی
 کیا کروں عرضِ غم کہ پاس اس کے
 میری ہر بات کا جواب نہی
 خوار کر کے ہمیں محبت میں
 زندگی خانماں خراب ، نہی
 اور کیا ہے یہ قلقلِ مینا
 میرے دکھ دیکھ کر شراب نہی

تھی نظر متن پر خیال کمیں
مجھ پے بے ساختہ کتاب نہیں

اس پے ظاہر ہوا نہ حال مرا
میں ہنا ایسی کامیاب نہیں

عشق میں آنسوؤں کے باب ہیں سب
ہے کہاں شاملِ نصاب نہیں

ہم تو پاگل تھے ٹوٹ کر روئے
خلق کیوں ہم پے بے حساب نہیں



زخم ہجراں کا بھر گیا کچھ کچھ
 زہر غم کام کر گیا کچھ کچھ
 عشق کے آخری مراحل میں
 سچ کہوں میں بھی ڈر گیا کچھ کچھ
 آج دشمن کی موت کا سن کر
 یوں لگا میں بھی مر گیا کچھ کچھ
 بے سبب محتسب نہیں خاموش
 مال اس کے بھی گھر گیا کچھ کچھ
 اب ترا دکھ نہیں رہا اتنا
 جی محبت سے بھر گیا کچھ کچھ



یہ بے دلی ہے تو کشتی سے یار کیا اتریں
ادھر بھی کون ہے؟ دریا کے پار کیا اتریں؟

تمام دولتِ جاں ہار دی محبت میں
جو زندگی سے لئے تھے ادھار کیا اتریں

ہزار جام سے ٹکرا کے جام خالی ہوں
جو آگئے ہیں دلوں میں غبار کیا اتریں

بس ان خاک، سرِ کوئے یار بیٹھے ہیں
اب اس مقام سے ہم خاکسار کیا اتریں

نہ عطر و عود، نہ جام و سبو، نہ ساز و سرود
فقیرِ شر کے گھر شربار کیا اتریں

ہمیں مجال نہیں ہے کہ بام تک پہنچیں
انہیں یہ عار، سر رہ گزار کیا اتریں

جو زخم داغ بنے ہیں وہ بھر گئے تھے فرازَ
جو داغ زخم بنے ہیں وہ یار کیا اتریں



کسی کی یاد میں اتنا نہ رو ہوا سو ہوا
کہ دل گنوں کے اب آنکھیں نہ کھو، ہوا سو ہوا

کوئی اسے نہ سنائے ہمارا حالِ خراب
مبادا اس کو بھی افسوس ہو، ہوا سو ہوا

جدائیوں کے زمانوں کا پوچھتے کیا ہو
گزر گئی جو گزرنی تھی، جو ہوا سو ہوا

محبتوں میں عجب تو نہیں اجڑ جانا
سو مجھ کو دیکھ کے حیراں نہ ہو ہوا سو ہوا

ہزار اور بھی دکھ دل نے پال رکھے ہیں
چلو یہ عشق کا آزار تو، ہوا سو ہوا

وفا میں ہم بھی کہاں ایسے خوش معاملہ تھے
فقط اسی سے گلہ کیوں کرو ہوا سو ہوا

فراز خوش ہو متاعِ ہنر سلامت ہے
بلا سے عشق کی بازی میں جو ہوا سو ہوا



ہنگامہ ؎ محفل ہے کوئی دم کہ چلا میں
ساقی مرے ساغر میں ذرا کم کہ چلا میں

کچھ دیر کی مہمان سرائے ہے یہ دنیا
چلنا ہے تو چل اے مرے ہدم، کہ چلا میں

پھر بات ملاقات کبھی ہو کہ نہیں ہو
پھر یار کہاں فرصتِ باہم کہ چلا میں

یہ سلسلہ ؎ آمد و شد کیا ہے کہ یارب!
اک شور نفس میں ہے دمادم کہ چلا میں

جو عمر گزاری ہے بڑی دھج سے گزاری
اب کوئی خوشی ہے نہ کوئی غم کہ چلا میں

یہ دل کا تپکنا کہ ٹھہرتا ہی نہیں ہے
یارو کوئی نشتر کوئی مرہم کہ چلا میں

اے دوست، فرماز ایک دیا ہے ترے در کا
کیا جانئے کہہ دے وہ کسی دم کہ چلا میں



نہ تو دیوانے ہی بن پائے نہ دانا مرے دوست
ہو گئے شر کے لوگوں میں تماشا مرے دوست

اب جو آنکھیں ہیں بیاباں تو یہی ہونا تھا
جانے کس دشت کو روتے رہے دریا، مرے دوست

تو ہمیشہ سے رہا چشم و چراغِ محفل
میں تو محفل میں بھی محفل میں نہیں تھا مرے دوست

اب بھی دل تجھ کو صدا دیتا ہے گاہے گاہے
مری جاں میری تمنا، میری دنیا، مرے دوست

تیری معصوم نگاہی پہ بھی حرف آئے گا
 صرف مجھ کو ہی گنہگار نہ ٹھرا مرے دوست
 میں محبت کے قرینوں سے نہیں ہوں غافل
 تجھ کو جانا ہے تو ہنس ہنس کے چلا جا مرے دوست
 اب کے آشوبِ زمانہ تھا قیامت کا فرماز
 کیسے کیسے مرے دشمن ہوئے کیا کیا مرے دوست



وہ تو پھر پہ بھی گزرے نہ خدا ہونے تک
جو سفر میں نہ ہونے سے کیا، ہونے تک
زندگی! اس سے زیادہ تو نہیں عمر تری
بس کسی دوست کے ملنے سے جدا ہونے تک
ایک اک سانس مری رہن تھی دلدار کے پاس
نقید جاں بھی نہ رہا قرض ادا ہونے تک
مانگنا اپنے خدا سے بھی ہے دریوزہ گری
ہاتھ شل کیوں نہ ہوئے دستِ دعا ہونے تک

اب کوئی فیصلہ ہو بھی تو مجھے کیا لینا
میں تو کب سے ہوں سردار، سزا ہونے تک

داورا! تیری مشیت بھی تو شامل ہو گی
ایک اچھے بھلے انساں کے برا ہونے تک

دستِ قاتل سے ہوں نادم کہ لو کو میرے
عمر لگ جائے گی ہمنگ حنا ہونے تک

دشت سے قلزمِ خون تک کی مسافت ہے فراز
قیس سے غالب آشفة نوا ہونے تک



خوش کون رہا پوشِ بھراں کو پین کر
 سو تو بھی نہ میلا یہ ستارہ سا بدن کر

 ہم سبزہ اے پامال ہیں کب در خورِ احسان
 تو بادِ صبا ہے، گل و لالہ سے سخن کر

 آوارہ نہ پھر، شامِ غربی کے مسافر
 آ اور مرے دل کی سرائے کو وطن کر

 کس ظلم پہ آخر کو ہوئی تجھ کو بھی حیرت
 کیوں دیکھ رہا ہے مجھے تصویر سی بن کر

بے جوششِ خوں، رنگِ محبت نہیں کھلتا
اے دشمنِ جاں، دل کو نہ محروم بدن کر

لب تشنہِ خوں کب سے ہے اک اک مرثہِ عیار
وا اے دہنِ زخمِ جگر، راہِ سخن کر

تیرا تو برا حال ہے پہلے سے زیادہ
لے اور فرماز اس سے نہ ملنے کے جتن کر



نامہ تو ہم نے بھیجا ہے اس کو صبا کے ہاتھ
اب دیکھئے گے نہ لگے آشنا کے ہاتھ

پھر یاد آ گئیں مجھے محرومیاں مری
دل بیٹھ سا گیا ہے دعا کو اٹھا کے ہاتھ

جانے کس آتیں سے پکارے مرا لو
منصف عدالتوں میں ہیں بیٹھے چھپا کے ہاتھ

دنیا بھی تیرے ساتھ ہے دل بھی تری طرف
اب میرا تیرا فیصلہ ٹھرا خدا کے ہاتھ

اس سرد مر کی ستم ایجادیاں نہ پوچھ
جو تاپتا ہے، میرے خطوں کو جلا کے، ہاتھ

عمروں کی دوستی کا صلح یہ ملا کہ وہ
رخصت ہوا تو بس یونہی رسما" ہلا کے ہاتھ

اے شکوہ سنج شدتِ اغیار، شکر کر
تجھ کو لگے نہیں ہیں کسی آشنا کے ہاتھ

تجدیدِ دوستی ہے تو اے میرے زُود رنج
تحوڑا سا مسکرا کے، ذرا سا بیٹھا کے ہاتھ

چاکِ قبا پہ میری نظر تھی کہ یار نے
جلدی سے رکھ دیئے مری آنکھوں پہ آ کے ہاتھ

ساقی نے کتنے پیار سے دیکھا فراز جب
مانگی شراب میں نے پیالہ بنایا کے ہاتھ



پھر ا ہوں سارے زمانے میں در بدر کیا
میں تیرے بعد بھی زندہ رہا مگر کیا

وہ جانتا تھا کہ کچھ روز وہ نہیں تھا تو میں
پکارتا رہا اس کو ادھر اوہر کیا

نہ اعتبار نہ آسودگی نہ قرب ترا
فقط تکلف دیوار و در ہے، گھر کیا

میں جس کے ہجر میں رویا ہوں پاگلوں کی طرح
وہ کل ملا تو ہنا میرے حال پر کیا

عزیز تر تھی جسے نیند شام وصل میں بھی
 وہ تیرے ہجر میں جاگا ہے عمر بھر کیا
 بس ایک شخص کی خاطر بس ایک دل کے لئے
 وطن کو تج دیا دیوانگی میں، گھر کیا
 کہاں کی دوستی، کیا فراق، کون فراز
 میں خود کو بھول گیا تجھ کو بھول کر کیا



کیوں نہ ہم عمدِ رفاقت کو بھلانے لگ جائیں
 شائد اس زخم کو بھرنے میں زمانے لگ جائیں

 نہیں ایسا بھی کہ اک عمر کی قربت کے نشے^۱
 ایک دو روز کی رنجش سے ٹھکانے لگ جائیں

 یہی ناصح جو ہمیں تجھ سے نہ ملنے کو کہیں
 تجھ کو دیکھیں تو تجھے دیکھنے آنے لگ جائیں

 ہم کہ ہیں لذتِ آزار کے مارے ہوئے لوگ
 چارہ گر آئیں تو زخموں کو چھپانے لگ جائیں

ربط کے سینکڑوں حیلے ہیں، محبت نہ سی
ہم ترے ساتھ کسی اور بہانے لگ جائیں

ساقیا! مسجد و مکتب تو نہیں میخانہ
دیکھنا، پھر بھی غلط لوگ نہ آنے لگ جائیں

قرب اچھا ہے مگر اتنی بھی شدت سے نہ مل
یہ نہ ہو تجھ کو مرے روگ پرانے لگ جائیں

اب فراز آؤ چلیں اپنے قبلے کی طرف
شاعری ترک کریں، بوجھ اٹھانے لگ جائیں



چاہت کے صبح و شام محبت کے رات دن
”دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن“

وہ شوق بے پناہ میں الفاظ کی تلاش
اظہار کی زبان میں لکھت کے رات دن

وہ ابتدائے عشق وہ آغازِ شاعری
وہ دشتِ جاں میں پہلی مسافت کے رات دن

سودائے آذری میں ہواۓ ضم گری
وہ بت پرستیوں میں عبادت کے رات دن

اک سادہ دل ، دیار کرشمہ گرائ میں گم
اک قریب ء طسم میں حیرت کے رات دن

لب ہائے نارسیدہ کی لرزش سے جاں بلب
صہبائے ناچشیدہ کی لذت کے رات دن

روئے نگار و چشم غزالیں کے تذکرے
گیسوئے یار و حرف و حکایت کے رات دن

ناکرده کاریوں پہ بھی بدنامیوں کا شور
آخر شماریوں پہ بھی تمہت کے رات دن

سوداگرائ منبر و مکتب سے روکشی
جاں دادگائِ دانش و حکمت کے رات دن

اہل قبا و اہل ریا سے گریز پا
وہ واعظانِ شر سے وحشت کے رات دن

میر و انیس و غالب و اقبال سے الگ
راشد، ندیم، فیض سے رغبت کے رات دن

فردوَسی و نظیری و حافظ کے ساتھ ساتھ
بیدل، غنی، کلیم سے بیعت کے رات دن

شیلے کا سحر، کیس کا دکھ، بازن کی دھج
ان کافرانِ عشق سے نسبت کے رات دن

تشکیک و ملدانہ رویے کے باوجود
رومی سے والمانہ عقیدت کے رات دن

جیسے مئے سخن سے صراحی بھری ہوئی
زورِ بیان و حسن طبیعت کے رات دن

یاروں سے شاعرانہ حوالے سے چشمگیں
غیروں سے عاشقانہ رقبت کے رات دن

شعری سفر میں بعض بزرگوں سے اختلاف
پیرانِ میکدہ سے بغاوت کے رات دن

رکھ کر کتابِ عقل کو نیاں کے طاق پر
وہ عاشقی میں دل کی حکومت کے رات دن

ہر روز، روز ابر تھا ہر رات چاند رات
آزاد زندگی تھی، فراغت کے رات دن

وہ صبح و شام در بدربی، ہم سنوں کے ساتھ
آوارگی و سیر و سیاحت کے رات دن

اک محشرِ خیال کے ہجران میں کائنا
تنہائی کے عذاب، قیامت کے رات دن

اک لعبتِ جمال کو ہر وقت سوچنا
اور سوچتے ہی رہنے کی عادت کے رات دن

اک رازدارِ خاص کو ہر وقت ڈھونڈنا
بے اعتباریوں میں ضرورت کے رات دن

وہ ہر کسی سے اپنا ہی احوال پوچھنا
اپنے سے بھی تجہیل و غفلت کے رات دن

بے وجہ اپنے آپ کو ہر وقت کونا
بے سود ہر کسی سے شکایت کے رات دن

رسوائیوں کی بات تھی رسوائیاں ہوئیں
رسوائیوں کی عمر میں شرت کے رات دن

اک دشمنِ وفا کو بھلانے کے واسطے
چارہ گروں کے پند و نصیحت کے رات دن

پلے بھی جاں گسل تھے مگر اس قدر نہ تھے
اک شہر بے امال میں سکونت کے رات دن

اس دولتِ ہنر پہ بھی آزارِ مغلی
اس روشنیِ طبع پہ ظلمت کے رات دن

پھر یہ ہوا کہ شیوهِ دل ترک کر دیا
اور تج دیئے تھے ہم نے محبت کے رات دن

ہر آرزو نے جامہِ حضرت پن لیا
پھر ہم تھے اور گوشہِ عزلت کے رات دن

ناداں ہیں وہ کہ جن کو ہے گم نامیوں کا رنج
ہم کو تو راس آئے نہ شرت کے رات دن

فکرِ معاش ، شر بدر کر گئی ہمیں
پھر ہم تھے اور قلم کی مشقت کے رات دن

”خونِ جگر“ ودیعتِ مژگانِ یار تھا“
اور مدعی تھے صنعت و حرفت کے رات دن

کیا کیا ہمیں نہ عشق سے شرمندگی ہوئی
کیا کیا نہ ہم پہ گزرے ندامت کے رات دن

آکاس بیل پی گئی اک سرو کا لمو
آسیب کھا گیا کسی قامت کے رات دن

کالٹی ہے ایک عمر اسی روزگار میں
برسول پہ تھے محیط ، اذیت کے رات دن

ساماں کھاں کہ یار کو مہماں بلایئے
امکاں کھاں کہ دیکھئے عشرت کے رات دن

پھرتے تھے میر خوار کوئی پوچھتا نہ تھا
قسمت میں جب تملک تھے قناعت کے رات دن

سو یہ بھی ایک عمدی زیاد تھا، گزر گیا
کٹ ہی گئے ہیں جبِ مشیت کے رات دن

نووارداں شرِ تنا کو کہا خبر
ہم ساکنان کوئے ملامت کے رات دن



پھرتے ہیں اب بھی دل کو گریاں کئے ہوئے
 جن وحشیوں پہ ہیں ترے احساں کئے ہوئے

 تجدیدِ عشق کیا ہو کہ برسوں گزر گئے
 تجھ سے کوئی سخن بھی مری جاں کئے ہوئے

 اب تجھ سے کیا گلہ ہو کہ اک عمر ہو گئی
 ہم کو بھی قصرِ کوچہ ، جاناں کئے ہوئے

 دل سے ہوئی ہے پھرتے بارے میں گفتگو
 تر آنسوؤں سے دیدہ و داماں کئے ہوئے

جی مانتا نہیں ہے کہ ہم بھی بھلا چکیں
تیری طرح سے وعدہ و پیار کئے ہوئے

کچھ ضد میں ناصحوں کی تجویز چاہتے رہے
کچھ پاسداری و دل ناداں کئے ہوئے

ہم وہ کہ تجویز کو شعر میں تصویر کر دیا
صورت گراں شہر کو حیراں کئے ہوئے

بازار صرد تھا نہ خریدار کم نظر
ہم خود تھے اپنے آپ کو ارزش کئے ہوئے

اے عشق ہم سے اور بھی ہوں گے زمانے میں
اچھے بھلے گھروں کو بیاباں کئے ہوئے

کچھ ہم سے نامراد کہ پھرتے ہیں کوکبو
دل کو کسی فقیر کا دامان کئے ہوئے

وعدہ کیا تھا اس نے کسی شام کا کبھی
ہم آج تک ہیں گھر میں چراغاں کئے ہوئے

اب اس کے جو رے بھی گئے ہم کہ جب سے ہیں
اپنے کئے پہ اس کو پشیاں کئے ہوئے

یہ رتیجے قبول کہ آرام سے تو ہیں
رکھتے تھے ورنہ خواب، پریشاں کئے ہوئے

ہم وہ اسیر ہیں کہ زمانے گزر گئے
”بند اپنے آپ پر درِ زندگی کئے ہوئے“

ترکِ وفا کے بعد ہوس اختیار کی
اس کاروبار میں بھی ہیں نقصاں کئے ہوئے

جانِ فراز مرگِ تمنا کے باوجود
بھولے نہیں ہمیں ترے احساں کئے ہوئے



صد رنگِ چمن دیدہ ۽ حیراں میں پھرے تھا
جوں موسمِ گل یار گلتاں میں پھرے تھا

وحشی کو ترے دشت نور دی نہیں بھولی
زنجیر بہ پا ہو کے بھی زندگی میں پھرے تھا

کرتے بھی تو ہم کیا کوئی تدبیر رفو کی
سوzen کی طرح درد دل و جاں میں پھرے تھا

شائد ہو تجھے یاد کہ اے صاحبِ محفل
اک سوختہ جاں بزم چراغاں میں پھرے تھا

کیا حال کہوں قلزم ہستی کے سفر کا
تینکے کی طرح نوح کے طوفان میں پھرے تھا

یہ چج ہے بدلنے میں زمانے نہیں لگتے
ہاں شیخ بھی کل صورتِ انساں میں پھرے تھا

مشکل سے ملے تم کو فراز ایسا دوانہ
جو شر میں رہ کر بھی غزالاں میں پھرے تھا



حیرت ہے لوگ اب بھی اگر خوش عقیدہ ہیں
 ہم ساکنانِ قریہ اُفت رسیدہ ہیں
 اس سنگ زار میں ہنر آذری ہے شرط
 کتنے صنم ہیں جو ابھی نا آفریدہ ہیں
 ہم حرف گر ہزار کمیں دل کے مرثیے
 اُس بارگاہ میں تو سراپا قصیدہ ہیں
 اہلِ جہاں ہماری روشن سے ہیں بے خبر
 ہم پیرہن دریدہ نہیں دل دریدہ ہیں

آتا ہے کب کوئی کسی آتش بجاں کے پاس
اچھا ہوا کہ آپ بھی دامن کشیدہ ہیں

اے زندگی اب اور کوئی تجربہ کہ ہم
تریاقِ عشق و زہر زمانہ چشیدہ ہیں

فرصت ملے تو آمرے خلوت کدے میں سُن
دیوان میں کماں جو سخن چیدہ چیدہ ہیں

ہم اہلِ دل سے اہلِ جہاں کے تعلقات
ہیں تو سی فراز مگر خط کشیدہ ہیں



دل بدن کا شریکِ حال کہاں
 ہجر پھر ہجر ہے وصال کہاں
 عشق ہے نام انتہاؤں کا
 اس سمندر میں اعتدال کہاں
 ایسا نشہ تو زہر میں بھی نہ تھا
 اے غمِ دل تری مثال کہاں
 ہم کو بھی اپنی پائماں کا
 ہے مگر اس قدر ملال کہاں

میں نئی دوستی کے موڑ پر تھا
آگیا ہے ترا خیال کھاں

دل کہ خوش فہم تھا سو ہے ورنہ
تیرے ملنے کا احتمال کھاں

وصل و ہجراء ہیں اور دنیا میں
ان زمانوں میں ماہ و سال کھاں

تجھ کو دیکھا تو لوگ حیراء ہیں
آگیا شر میں غزال کھاں

تجھ پر لکھی تو سچ گئی ہے غزل
آ ملا خواب سے خیال کھاں

اب تو شہر مات ہو رہی ہے فراز
اب بچاؤ کی کوئی چال کھاں



ایک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہستا جاتا
کاش منزل سے بھی آگے کوئی رستا جاتا

اے مرے ابر گریزان میری آنکھوں کی طرح
گر برنا ہی تجھے تھا تو برستا جاتا

آج تک یاد ہے اظہارِ محبت کا وہ پل
کہ مری بات کی لکنت پہ وہ ہستا جاتا

چلو پتھرنہ اٹھاتے ترے دیوانے پہ لوگ
سر را ہے کوئی آوازہ ہی کتا جاتا

اتنے محدود کرم سے تو تعاقف بہتر
گر ترنا ہی مجھے تھا تو ترستا جاتا



وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سبھی رنگ آثار کے شر کا
کوئی شخص تھا مرے شر میں، کسی دُور پار کے شر کا
چلو کوئی دل تو اداس تھا چلو کوئی آنکھ تو نم رہی
چلو کوئی در تو کھلا رہا، شبِ انتظار کے شر کا
کئی خوشبوئیں درِ دوست تک مرے ساتھ شمع بدست تھیں
مجھے پوچھنا نہ پڑا پتہ، مرے گل عذار کے شر کا
یہ جو میں نے تازہ غزل کی سو ہے نذرِ اہلِ فراق کی
کہ نہ مل سکا کوئی نامہ بر مجھے میرے یار کے شر کا

سو متاع جاں کو لئے ہوئے پلٹ آئے تیرے گرفتہ دل
 کے بیچتے کہ ملا نہیں کوئی اعتبار کے شر کا
 مری طرزِ نغمہ سرائی سے کوئی با غبال بھی تو خوش نہ تھا
 یہ مرا مزاج ہے کیا کروں کہ میں ہوں بمار کے شر کا
 کسی اور دلیں کی اور کو سنا ہے فراز چلا گیا
 سبھی دکھ سمیٹ کے شر کے، سبھی قرض اتار کے شر کا